سفرنامۂ روم ومصروشام—ایک مطالعہ

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

RZ-B901، فلیٹ نمبر 402، لین نمبر 24، تغلق آباد ایکسٹینشن، نئی دہلی۔110019

علامہ شبلی کا یہ سفرنامہ جو ۲۵۳ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا یعنی اختتام سفر کے تقریباً دو سال بعد۔ اس سے پہلے اردو میں کئی سفرنامے لکھے جا چکے تھے۔ اردو کا پہلا سفرنامہ ہونے کا اعزاز یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے ''تاریخ یوسفی'' معروف بہ ''عجائباتِ فرنگ'' کو حاصل ہے۔ یوسف خاں نے یہ تاریخی سفر ۱۸۳۷ء میں کیا تھا یعنی شبلی کے سفر روم سے پچپن سال پہلے۔ یہ سفرنامہ پہلی بار دہلی سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اور پھر ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ اسے لاہور سے شائع کیا۔[1]

سرسید احمد خاں کا سفرنامہ موسوم بہ ''مسافرانِ لندن'' بھی ایک اہم سفرنامہ ہے۔ سرسید نے یہ سفر ۱۸۶۹ء میں سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب لکھنے کی غرض سے کیا تھا۔ انھوں نے لندن کے دوران قیام میں اس شہر کے جو علمی وتمدنی احوال ومناظر دیکھے ان کا حال اس سفرنامے میں بیان کیا ہے۔ یہ سفرنامہ سائنٹفک سوسائٹی کے گزٹ میں قسط وار شائع ہوتا رہا، لیکن مذہبی حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کی وجہ سے یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔[2] محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اس سفرنامے کو مرتب کر کے ۱۹۶۱ء میں مجلسِ ترقی ادب لاہور سے شائع کیا۔ ان دو سفرناموں کے علاوہ بھی کئی سفرنامے لکھے گئے ہیں۔

سفر کے اغراض مختلف ہوتے ہیں۔ سب سے عمدہ سفر وہ ہے جو علمی غرض سے کیا جائے۔ علامہ شبلی کا سفرنامہ اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ خالص علمی سفر تھا، یعنی اپنی زیرِ تجویز تصنیفات کے لیے بلادِ اسلامیہ (ترکی، مصر، شام) کے مختلف کتب خانوں سے ضروری علمی مواد حاصل کرنا اور وہاں کے تعلیمی نظام سے واقفیت اور اربابِ علم وکمال سے ملاقات کر کے مختلف علمی و مذہبی امور پر تبادلۂ خیال کرنا تھا۔ خود علامہ شبلی نے اس کتاب کی تمہید میں غایت سفر کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا۔ یہی خیال تھا کہ جس نے اوّل اوّل اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی۔ یہ یقین تھا کہ مصر وروم وشام میں اسلامی تعلیمات کا جو بقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک ایسا سلسلۂ تالیف ضرور تیار ہوسکتا ہے۔''[3]

اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے علامہ شبلی پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ جن سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے روانہ ہوئے۔ ۳۰/اپریل کو بمبئی پہنچے اور یکم مئی کو بحری جہاز پر سوار ہوئے اور ۷/مئی کو عدن، ۱۳/مئی کو سوئز اور ۱۴/مئی کو پورٹ سعید پہنچ گئے۔ یہاں ''فراق بنی و بینک'' کا معاملہ پیش آیا یعنی آرنلڈ انگلینڈ کے لیے روانہ ہوئے اور شبلی قسطنطنیہ کے لیے۔ بیروت، سائپرس (قبرص)، رودس اور سمرنا ہوتے ہوئے ۲۳/مئی کو ان کا جہاز قسطنطنیہ (استنبول) پہنچا۔ اس شہر میں ان کا قیام تین مہینے رہا۔ اس مختصر عرصے میں شبلی نے قسطنطنیہ کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا اسے سفرنامے میں کہیں مجملاً اور کہیں تفصیل سے لکھا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کا ذکر کروں کہ شاعر ہونے کی وجہ سے علامہ شبلی کی طبیعت میں زود حسی اور انفعال بہت زیادہ تھا۔ وہ کسی حالت یا واقعہ یا منظر کو دیکھ کر بہت جلد متأثر ہوجاتے تھے۔ اس انفعالی حالت کا ظہور سفرنامے میں کئی مقامات پر ہوا ہے۔ انھیں ترکی اور ترک قوم سے بڑا جذباتی تعلق تھا، وہ اس ملک کو اسلام کی گزشتہ عظمت ورفعت کی آخری یادگار اور ترکوں کو ملّت اسلامیہ کی عزت وآبرو کا نگہبان سمجھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ترکی کی سرزمین کے ذرّہ ذرّہ سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔

علامہ شبلی نے ترکی میں جس چیز پر زیادہ توجہ مرکوز کی وہ اس کا تعلیمی نظام تھا۔ چنانچہ قسطنطنیہ کی اجمالی تاریخ، اس کے مختصر حالات، وسعت وتمدن، لباس اور وضع اور عدالتوں (نظامِ قضا) کا حال بیان کرنے کے بعد ترکی کی جدید اور قدیم تعلیمی حالت کا ذکر کیا ہے اور اس کے بڑے بڑے کالجوں اور اسکولوں میں بورڈنگ کا طریقہ، طالب علموں کا لباس اور ترکوں کی علمی حالت کو تفصیل سے لکھا ہے۔

علامہ شبلی کا خیال تھا کہ مجرد تعلیم کافی نہیں ہے اس کے ساتھ تربیت بھی ضروری ہے، لیکن تربیت کا کام اسی وقت ٹھیک ڈھنگ سے انجام پاسکتا ہے جب تعلیم گاہیں اقامتی ہوں جہاں تمام لڑکے باہم مل کر نظم وڈسپلن کے ساتھ رہتے ہوں۔ اس طریقۂ تربیت کو بورڈنگ سسٹم کہا جاتا ہے۔ اقامتی زندگی سے طلبا کے اندر نظم وقاعدہ کی پابندی کی عادت اور دلوں میں قومی اتحاد واتفاق، ایثار وقربانی اور مساوات کے صالح جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب شبلی نے قسطنطنیہ کے اقامتی کالجوں اور ان کے نظام تربیت کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''تمام بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلبا رہتے ہیں، لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس، وضع، مکان، فرنیچر، تمام چیزیں ایک سی ہیں اور طالب علموں کی حالتوں میں فرق مراتب کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ بورڈنگ کا کرایہ اور خوراک کی جو فیس لی جاتی ہے اس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے ہیں۔ تمام لڑکے میز اور کرسیوں پر کھاتے ہیں اور ہر چیز میں تکلف، صفائی، خوش سلیقگی کا نہایت اہتمام کیا جاتا ہے۔''[۴]

لیکن قدیم یعنی مذہبی تعلیم جدید تعلیم کے مقابلے میں نہایت پستی کی حالت میں تھی، نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس دونوں ناقص تھے۔ شبلی لکھتے ہیں:

''قدیم تعلیم نہایت ابتر حالت میں ہے۔ طلبہ کا گزر بسر زکوٰۃ پر ہے جو وہ تین مہینے کی تعطیل میں وصولی کرتے ہیں۔''[۵]

نصاب تعلیم کے متعلق شبلی کے تأثرات ملاحظہ ہوں:

''قدیم تعلیم کے متعلق سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ تعلیم کا اسٹینڈرڈ نہایت چھوٹا رکھا گیا ہے۔ علم ادب کا پتہ نہیں، منطق وفلسفہ میں ایساغوجی اور شمسیہ انتہائی کتابیں ہیں۔ صحاح ستہ شاید ہی کسی مدرسے میں پڑھائی جاتی ہو۔ معانی وبلاغت اور اصول فقہ کا بھی یہی حال ہے۔ فقہ پر البتہ توجہ زیادہ ہے، لیکن عامیانہ اور مقلدانہ ہے۔''[۶]

جس دور میں میں کسی عالم دین یا مصلح قوم کا ذہن مشکل سے عورتوں کی تعلیم کی طرف جاتا تھا، علامہ شبلی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کی تعلیم کے بغیر وہ معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا جو قوم کی اجتماعی زندگی کی تشکیل اور اس کی علمی وتہذیبی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ علامہ کے کئی خطوط میں جو عطیہ فیضی (وفات: ۱۹۶۷ء) کے نام ہیں، اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔[۷] چنانچہ جب انھوں نے قسطنطنیہ میں لڑکیوں کے تعلیمی اداروں اور ان کی تعلیم وتربیت کے طریقوں کو بچشم خود دیکھا تو بہت مسرور ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''ترکوں کی تہذیب وترقی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر اور قابل تقلید ہے وہ عورتوں کی تعلیم وتربیت اور طریقۂ معاشرت ہے۔ دنیا کی دو بڑی قومیں یعنی یورپین اور ایشیاٹک اس مسئلے میں افراط و تفریط کے انتہائی کناروں پر واقع ہیں اور اس وجہ سے دونوں کی حالت قابلِ اعتراض ہے۔ ترکوں نے ایسا معتدل طریقہ اختیار کیا ہے جو دونوں خوبیوں کا جامع اور دونوں کے عیوب سے خالی ہے۔ ٹرکش عورتیں تعلیم یافتہ ہیں، لیکن بے شرمی، شوخی، بے جا آزادی، رقاصی کی (اور وہ بھی غیروں کے ساتھ) ان کو تعلیم نہیں ہوئی ہے۔ وہ پردے کی پابند ہیں، لیکن جاہل، دنیا سے بے خبر، مکان کے قفس میں بند، حیوان نما انسان نہیں ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سرکاری اور خانگی مدرسے کثرت سے ہیں اور پردہ وحفاظت کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ شرفا کو اپنی لڑکیوں کے بھیجنے میں تامل نہیں ہوتا۔''[۸]

جدید تعلیمی اداروں کے بعد جو دوسری چیز علامہ شبلی کو پسند آئی وہ فوجی ساز و سامان کی تیاری میں ترکوں کی خود کفالتی تھی۔ جہاز سازی کے ایک کارخانہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''نہایت قابل تعریف بات یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان کارخانہ صرف ترک چلاتے ہیں۔ تمام افسر اور کاریگر اور ملازم ترک ہیں، صرف ایک یورپین معمولی درجے کا ملازم ہے اور وہ بھی قدامت کے لحاظ سے بحال رکھا گیا ہے۔ انجن بھی یہاں تیار ہوتے ہیں اور ترکوں کا بیان ہے کہ یورپ کے بنے ہوئے انجنوں سے کسی بات میں کم نہیں ہوتے۔ ایک افسر نے مجھ سے کہا کہ اس قسم کے تمام کاموں میں ہم کو یورپ کی احتیاج نہیں رہتی.... تار پیڈو کشتیاں اور دوسرے فوجی سامان بھی اعلیٰ درجے کے بنائے جاتے ہیں۔''[۹]

شبلی نے ترکی زبان کی ترقی، وہاں کے مشہور اخبارات ورسائل، چھاپے خانے، کتب خانے، زوایا اور خانقاہیں، مساجد جامع بالخصوص ایا صوفیہ[۱۰]، خیراتی مسافر خانے اور مشہور سیاحتی مقامات وغیرہ کا پُر لطف حال لکھا ہے۔ اسی سلسلۂ بیان میں جمعہ اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر سلطانی جلوس کا دل آویز نقشہ کھینچا ہے جس کو پڑھ کر کوئی شخص اس قوم کی عظمت وشوکت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ خود علامہ شبلی یہ عظیم الشان منظر دیکھ کر مسحور ہوگئے۔ لکھتے ہیں:

''جب خطیب نے سلطان المعظم کی طرف اشارہ کر کے پُر جوش آواز میں یہ الفاظ پڑھے: **اللّٰھم انصر ھذا السلطان**.... تو عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ میرا یہ حال تھا کہ آنکھ سے متصل آنسو جاری تھے اور دیر تک زبان سے دعائیہ الفاظ نکلتے رہے۔''[۱۱]

شبلی نے ترکوں کے عادات واطوار میں جس چیز کو سب سے زیادہ لائق ستائش قرار دیا ہے وہ ان کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کی صفت ہے۔ اوّل الذکر کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک عام بات یہ ہے کہ بازار میں چلتے پھرتے جس شخص سے گووہ کسی مرتبے کا آدمی ہو راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور تم کو راستہ بتائے گا۔ بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچدار گلیوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقاً کوئی ترک آنکلا تو اس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہولیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں پہنچا کر واپس آیا۔''[۱۲]

شاید ترکوں کی اس خوش اخلاقی میں وہاں کی آب وہوا کا بھی دخل ہو۔ شبلی نے قسطنطنیہ کی آب وہوا کی خوبی کا ذکر بڑے ستائشی انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''آب وہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے، کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا خود مجھ کو تجربہ ہوا اس قدر خوشگوار ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے امرا شملہ و نینی تال کے بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے۔ پانی پہاڑ سے آتا ہے اور نہایت ہاضم اور خوشگوار ہے۔''[۱۳]

قسطنطنیہ کے دوران قیام میں علامہ شبلی نے ترکوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو غور سے دیکھا۔ انھوں نے ترکی کے تمام بڑے کتب خانوں سے جن میں مختلف اسلامی علوم وفنون کی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا، جی بھر کر استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ وہاں کے ادبا وشعرا، علما وفضلا اور ارباب حکومت سے بھی ملاقاتیں کیں۔ معروف مذہبی اشخاص میں شیخ عبدالفتاح جو اصلاً شامی تھے، شیخ علی طلبیان، شیخ عبدالباسط، شیخ ظاہر مغربی اور پروفیسر انطون (ایڈیٹر ہفتہ وار رسالہ 'البشیر') قابل ذکر ہیں۔[۱۴] غازی عثمان پاشا سے بھی جن کی فوجی قیادت میں ترکی نے روس پر فتح حاصل کی تھی، شرف ملاقات حاصل ہوا۔ اسی مرد مجاہد کی سلسلۂ جنبانی سے علامہ شبلی کو حکومت ترکی کی طرف سے تمغۂ مجیدیہ عطا کیا گیا۔

علامہ شبلی کے سفر قسطنطنیہ کی کامیابی کا سہرا عطیہ فیضی کے والد حسن علی فیضی معروف بہ حسن آفندی (وفات: ۱۹۰۳ء) کے سر ہے جو ان دنوں قسطنطنیہ میں مقیم تھے۔ ترکی اور عربی زبان کے علاوہ کئی مغربی زبانیں جانتے تھے۔ حکومت کے کارپردازوں سے بھی ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کوئی قابل ذکر ہندوستانی قسطنطنیہ میں وارد ہوتا تو وہ اس کی ہر طرح مدد کرتے تھے۔ جوں ہی انھیں شبلی کی آمد کی خبر ہوئی وہ ان سے آکر ملے اور علامہ کے علم وفضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ پھر تو ان کے دست و بازو بن گئے۔ عطیہ فیضی لکھتی ہیں:

''میرے والد صاحب حسن علی فیضی سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید کے بہت زیادہ قریب تھے۔ ان کا اصول تھا کہ ہندوستان سے کوئی معزز مسافر آتا تو اس کو مہمان رکھتے۔ چنانچہ جب مولانا شبلی استنبول تشریف لے گئے تو والد نے انھیں اپنا مہمان رکھا اور ان کے علمی مذاق کو دیکھ کر وہاں کے ادیبوں اور علما سے ان کا تعارف کرایا اور انھیں بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں۔ مولانا نے جب مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو والد ان کی رہنمائی کے لیے ان کے ساتھ گئے اور ہر جگہ کے علما سے ان کا تعارف کرایا اور نادر کتب بہم پہنچائیں جن سے مولانا شبلی بہت خوش ہوئے۔''[۱۵]

ایک دوسرے مضمون میں عطیہ فیضی نے لکھا ہے:

''میرے والد حسن علی فیضی آفندی خلفاءِ دولِ عثمانیہ کی سرکار میں ایک بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ ترکیہ میں جتنے ہندوستانی آتے تھے ان سب کے لیے میرے والد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ کوئی ساٹھ سال کی مدت گزری، شبلی استنبول میں نادر کتب اور مخطوطات کی تلاش میں وارد ہوئے۔ والد نے نہ صرف ان کی خاطر تواضع اور مہمان نوازی کی بلکہ انھوں نے سرکاری، نیم سرکاری اور ذاتی کتب خانوں تک انھیں پہنچنے میں بھی بڑی مدد دی۔ والد کو لسانیات سے بڑا شغف تھا، وہ متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے قسطنطنیہ کے دورے میں شبلی کے ساتھ رہ کر مدد کی۔ انھیں تمام متعلقہ اور ضروری معلومات بہم پہنچائیں۔ والد نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایشیائی ترکستان اور فلسطین تک گئے اور انھیں تمام اہم کتب خانوں کی سیر کرائی۔''[۱۶]

عطیہ فیضی کے مذکورہ بیان کی تائید جناب اقبال سہیل (وفات: ۱۹۵۵ء) کے ایک مضمون سے ہوتی ہے جس میں وہ برسبیلِ تذکرہ لکھتے ہیں:

''جاننے والے جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم کی غزل گوئی محض ایک دماغی تفریح تھی اور خطوط شبلی موسومہ عطیہ کی حقیقت بزرگانہ ہمت افزائی سے زیادہ نہیں تھی۔ خانوادۂ فیضی سے مولانا کے روابط قدیم تھے۔ اسی دودمانِ علم وتہذیب کے ایک چشم و چراغ حسن آفندی تھے جنھوں نے قسطنطنیہ کے زمانۂ قیام میں علامہ مرحوم کے ساتھ نہایت مخلصانہ برتاؤ کیا تھا۔ اسی وقت سے دونوں خاندانوں میں عزیزانہ تعلقات قائم ہوگئے۔''[۱۷]

لیکن علامہ شبلی نے اپنے اس خیر خواہ یعنی حسن آفندی کا ذکر صرف ایک تاجر اور خلیق مہمان نواز ہندوستانی کی حیثیت سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بدرالدین طیب بیرسٹرایٹ لا ساکن بمبئی کے عموزاد بھائی ہیں۔ ہندوستانی اشیا کی تجارت کرتے ہیں۔ پہلے ان کا کارخانہ بڑے فروغ پر تھا... لیکن اب فیشن بدل جانے سے ان چیزوں کی قدر نہیں رہی اور کارخانہ سست ہوگیا تاہم خوشحالی سے بسر کرتے ہیں.... تمام لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ سلطان کے یہاں سے مڈل بھی ملا ہے۔ انگریزی بخوبی جانتے ہیں۔ نہایت خوش اخلاق، فیاض، روشن ضمیر اور نیک طبع آدمی ہیں۔ ہندوستانیوں سے ان کو عجیب اُنس و محبت ہے اور یہی حبّ الوطنی ہی میری اور ان کے تعارف کا ذریعہ ہوئی.... میں جب تک وہاں رہا اکثر میرے مکان پر تشریف لاتے تھے، کئی دفعہ دعوت کی اور اپنے گھر لے گئے۔''[۱۸]

عطیہ فیضی اور علامہ شبلی کے بیانات میں بڑا فرق ہے۔ شبلی کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حسن آفندی استنبول میں کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر مامور تھے اور متعدد زبانیں جانتے تھے اور انہی کی مدد سے وہ ان جگہوں تک پہنچ سکے جہاں تک رسائی آسان نہیں تھی۔ شبلی کے ایک خط سے جو انھوں نے اپنے والد کو قسطنطنیہ سے لکھا تھا، حسن آفندی کی اس مدد کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ

تھا۔ میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا۔ جامعہ حمیدیہ میں داخل ہوا۔ سلطان المعظم بڑی شان وشوکت سے آئے، لیکن میں کچھ دیکھ نہ سکا... نماز کے بعد حسن آفندی نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا اور مسجد کے صحن میں جہاں بادشاہ اور سردارانِ فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے لے جا کر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے۔''[19]

اس خط کا آخری جملہ صراحت کر رہا ہے کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو کسی بڑے سرکاری منصب پر فائز ہوگا۔ جناب ماہر القادری (وفات: ۱۹۷۸ء) نے لکھا ہے کہ وہ ترکی میں برطانیہ کے سفیر تھے۔[20] اب سوال یہ ہے کہ شبلی نے حسن آفندی کی زبان دانی کے ذیل میں صرف اتنا لکھ دیا کہ وہ انگریزی بخوبی جانتے تھے حالاں کہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، وہ ترکی اور عربی کے علاوہ کئی مغربی زبانیں جانتے تھے۔

اس بے نیازی کی دو ہی وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ علامہ شبلی اپنے ہم عصر اہلِ کمال کے علم وفضل کے اعتراف میں فیاض دل نہیں تھے جیسا کہ مولوی ڈاکٹر عبدالحق (وفات: ۱۹۶۱ء) نے لکھا ہے، یا یہ ان کا حد سے بڑھا ہوا احساس خودداری تھا۔ مہدی حسن افادی (وفات: ۱۹۲۱ء) کا یہی خیال تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کی افراطِ خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے۔''[21]

قسطنطنیہ کے بعد علامہ شبلی کے سفر کی دوسری منزل شام تھا۔ ماہ جولائی میں وہ بیروت کے لیے روانہ ہوئے۔ بیروت میں چند روز قیام کر کے وہاں کے تعلیمی اداروں کا بغور معائنہ کیا اور اس کی علمی وادبی ترقی سے بے حد متاثر ہوئے، لیکن یہ دیکھ کر افسردہ وملول ہوگئے کہ مسلمان علم کے میدان میں عیسائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''افسوس اور سخت افسوس ہے کہ یہ تمام علمی ترقی اور تصنیف وتالیف جو کچھ ہے عیسائیوں کے ساتھ خاص ہے، مسلمان ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔''[22]

بیروت کے مشہور کالج ''الکلیة السوریة العلمیة'' کا دورہ کر کے علامہ کی افسردگی بہت بڑھ گئی۔ اتنا عظیم الشان کالج کلیتاً عیسائی اربابِ علم وکمال کی نگرانی میں ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھا۔ اسی کالج کے ایک پروفیسر نے اخطل نصرانی کے دیوان کی تصحیح کر کے شائع کیا تھا۔ اخطل، فرزدق اور جریر کا معاصر اور دولت بنی اُمیّہ کا مشہور شاعر تھا۔ شبلی نے بیروت کے کئی علما سے بھی ملاقات کی جن میں عبدالباسط آفندی، شیخ عمر جبیلی اور عبدالرحمٰن الجزائری قابل ذکر ہیں۔[23]

۸ر صفر ۱۳۱۰ھ کو شبلی بوقت شام بیروت سے بیت المقدس کے لیے روانہ ہوئے۔ دوسرے دن یاقہ (انگریزی میں جافا کہتے ہیں) پہنچے۔ بیت المقدس یہاں سے ۴۰ میل دور ہے۔ اس مقدس شہر کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مشہور مقامات میں سے مسجد اقصیٰ اور قمامہ کی زیارت کی۔ قمامہ دراصل ایک بڑا گرجا ہے اور عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اسی جگہ مصلوب اور مدفون ہوئے اور پھر آسمان پر چلے گئے۔[24]

اکتوبر میں علامہ شبلی اسکندریہ آئے اور وہاں سے بذریعہ ٹرین قاہرہ پہنچے۔ ٹرین کے اس سفر میں انھوں نے مصر کی دیہی زندگی کی ایک جھلک دیکھی اور راستے میں دونوں طرف واقع کھیتوں کی ہریالی دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ مصر کے اس علاقے کی شادابی اور زرخیزی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس سفر میں جس قدر حصّہ مصر کا میری نظر سے گزرا عجیب سرسبز و شاداب تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی نہایت سرسبز کھیتیاں نظر آتی تھیں۔ اسکندریہ سے قاہرہ تک جس قسم کی عمدہ پیداوار نظر آئی میں نے ہندوستان میں پچاس ایکڑ زمین بھی ایسی نہیں دیکھی۔ ریل شام کے قریب قاہرہ پہنچی اور میں نے جامعہ ازہر کے قریب ایک لوکاندہ (ہوٹل) میں قیام کیا۔''[25]

علامہ شبلی نے بلاد اسلامیہ کے دوسرے شہروں کی طرح مصر میں بھی سب سے پہلے قاہرہ کے تعلیمی حالات کا جائزہ لیا۔ چنانچہ ایک جدول کی صورت میں اس کے تمام معروف اسکولوں اور کالجوں کے نام، ان کے سالانہ مصارف، طالب علموں کی تعداد اور دیگر امور کا ذکر کیا ہے۔ علامہ کو طرزِ تعلیم کے اعتبار سے جو کالج سب سے زیادہ پسند آیا وہ ''دارالعلوم'' تھا۔ اس میں قدیم تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ تعلیم کے اسی ''معجون مرکب'' میں وہ مسلمانوں کے تمام دینی اور قومی مسائل کا حل دیکھتے تھے۔ یہ کالج درحقیقت ان کے دیرینہ خواب کی حسین تعبیر تھا۔ لکھتے ہیں:

''مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا، جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لیے کافی سمجھا وہ یہی کالج ہے۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی مرتبہ تک پہنچ جائیں، لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو ان کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔ بے شبہ مشرقی تعلیم کی موجودہ اسکیم نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے، لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔''[26]

آگے مزید لکھتے ہیں:

''جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔ صرف یہ دارالعلوم ہے جو دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی پورا کامیاب نہیں ہوا ہے۔''[27]

لیکن علامہ نے دارالعلوم کا جو نصاب تعلیم درج کیا ہے وہ کسی طرح بھی قابل تعریف نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ قدیم اور جدید علوم کے اختلاط سے وہ بہت بوجھل ہو گیا ہے۔ طلبا کے کندھوں پر ایک ایسا بھاری بوجھ رکھ دیا گیا ہے کہ نہ تو وہ اس بار گراں کے متحمل ہو سکتے تھے اور نہ ہی ان علوم سے مطلوبہ قابلیت ان کے اندر پیدا ہو سکتی تھی۔ قدیم اور جدید علوم کا یہ ایک غیر دانش مندانہ اختلاط تھا۔ اس پر مزید گفتگو میں آگے کروں گا۔

علامہ شبلی نے قدیم مذہبی درس گاہ جامعہ ازہر کی تعلیم کا حال بھی لکھا ہے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ قاہرہ میں علامہ کا قیام ایک ہوٹل میں تھا، لیکن چند روز کے بعد ایک خیر خواہ کے تعاون سے خود جامعہ ازہر میں ان کے قیام کا انتظام ہو گیا تھا، اور وہ ایک مہینے سے کچھ زیادہ یہاں مقیم رہے۔ اس قیام کا فائدہ یہ ہوا کہ انھیں ازہر کے نظام تعلیم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس مذہبی درس گاہ کا حال شبلی کے لفظوں میں ملاحظہ:

> ''مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا، کسی چیز سے نہیں ہوا۔ ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصّے کے مسلمان جمع ہوں.... جس کے طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ اُمید نہیں ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے۔ تربیت اور معاشرت کا جو طریقہ ہے اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش، ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے۔ میں نے ایسے طلبہ دیکھے ہیں جنھیں عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی... اس سے زیادہ تر افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے... اس کا نصاب تعلیم اتنے بڑے دارالعلوم کے کسی طرح شایان شان نہیں۔''[۲۸]

علامہ شبلی نے قاہرہ کے دوسرے تعلیمی اداروں (قانونی کالج، طبیہ کالج، انجینئرنگ کالج وغیرہ) مطابع، آثار قدیمہ، مختلف قسم کی انجمنوں، تھیٹر، کلب، مزارات اور تفریحی مقامات کا بھی حال لکھا ہے۔ مصر میں میلاد النبی کا جشن بڑے اہتمام اور دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، لیکن اس موقع پر مسلمان جس قسم کے اعمال و افعال کرتے تھے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے سخت قابل اعتراض تھے۔[۲۹] علامہ نے مصر کے بعض علماء و فضلاء کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ان اہل علم میں امین بک فکری، احمد زکی، شیخ محمد عبدہ، شیخ حمزہ اور فتح اللہ قابل ذکر ہیں۔

علامہ شبلی نے سفرنامے کے آخر میں عربوں کی فیاضی اور خوشی اخلاقی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے لیے یہ سفر آسان ہو گیا۔[۳۰] سفرنامے کے اختتام پر جدید عربی زبان کے الفاظ (مولّدہ) کی ایک مختصر فرہنگ دی گئی ہے جو ان دنوں مصر و شام کے اخبارات و رسائل میں بکثرت استعمال کیے جا رہے تھے اور جن کو سمجھے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں تھا۔

سفرنامے کا حسن و قبح

سفرنامے کے مختصر تعارف کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حسن و قبح کا بھی ذکر کیا جائے۔ علامہ شبلی ایک بڑے انشا پرداز تھے اس لیے سفرنامے کی زبان بھی لطیف، سلیس اور شگفتہ ہے۔ اس سفرنامے کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں علامہ نے بلاد اسلامیہ کی ہر چیز کو خواہ اس کا تعلق حکومت کے نظم و نسق سے ہو یا نظام تعلیم و ترتیب سے یا اخلاق و تہذیب سے، ایک معلّم اور خیر خواہِ قوم کی نظر سے دیکھا اور اپنے محسوسات و مشاہدات کو بے کم و کاست نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

علامہ شبلی کی قومی غیرت کا اظہار ان متعدد واقعات کے بیان سے ہوتا ہے جو دوران سفر ان کو پیش آئے۔ ترکی جاتے وقت جب ان کا جہاز عدن پہنچا تو بندرگاہ پر سمالی قوم کے لڑکوں کی مبتذل حرکتوں کو دیکھ کر جو وہ انعام کے لالچ میں کر رہے تھے، ان کا دل بیتاب ہو گیا اور آنکھیں بھر آئیں کہ اب مسلمان قوم کی یہ حالت ہو گئی ہے۔[۳۰] پورٹ سعید شہر کے حال میں لکھا ہے:

> ''جب کوئی بلند اور شاندار عمارت دیکھتا تو اس خیال سے خوش ہوتا کہ الحمدللہ ان ملکوں میں مسلمان خوش حال اور دولتمند ہیں، لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی یورپین سوداگر کا مکان ہے۔ سارے شہر میں ایک عمدہ دکان یا بلند عمارت کسی مسلمان کی نہ تھی، افسوس۔''[۳۱]

بیروت کی سیر کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''جب کوئی شخص شان و شوکت کے ساتھ گاڑی یا گھوڑے پر سوار سامنے سے گزرتا تو میں اپنے رہنما (گائڈ) سے پوچھتا کہ کون ہے؟ اور اکثر وہ یہ جواب دیتا کہ عیسائی۔''[۳۲]

جب ان کا جہاز سائپرس (قبرص) پہنچا اور اشہر کو بچشم خود دیکھا تو مسلمانوں کی حالت دیکھ کر انھیں بہت دُکھ ہوا:

> ''جس قدر بلند مکانات یا عمدہ دکانیں نظر آئیں، دریافت سے معلوم ہوا کہ کل عیسائیوں کی ہیں۔''[۳۳]

قسطنطنیہ سے واپسی پر جب شبلی نے دوبارہ بیروت کی سیر کی تو دیکھا کہ اس شہر میں علمی ترقی کے جو آثار نظر آتے ہیں وہ سب عیسائیوں کی علمی مساعی کے ثمرات ہیں۔ بڑے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

> ''میں نے ان عیسائیوں کی بلند ہمتی اور ذوق علمی کا دل سے اعتراف کیا۔ مسلمانو! تم کو بھی کچھ غیرت آتی ہے۔''[۳۴]

اس سفرنامے کی تیسری نمایاں خوبی اس کا مؤرخانہ طرز بیان ہے۔ اگر شبلی مؤرخ نہ ہوتے تو یہ سفرنامہ اتنا دلچسپ اور تاریخی معلومات سے لبریز نہ ہوتا۔ اس کی چوتھی قابل ذکر خوبی جزئیات نگاری ہے جس کی وجہ سے زیر مشاہدہ واقعہ یا منظر کا پورا مرقع نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور پڑھنے والے پر دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

سفرنامے کا پانچواں وصف یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر انیسویں صدی کے چند اہم بلاد اسلامیہ کے مذہبی اور تہذیبی حالات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور

صاف محسوس ہوتا ہے کہ مسلم قوم تیزی کے ساتھ زوال کی کھائی کی طرف رواں دواں ہے۔علامہ شبلی سفرنامے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کرلیا جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں سے قریب قریب ہے۔صنعت سے ان کا کچھ واسطہ نہیں،تجارت میں ان کا حصّہ کم ہے،معمولی دکاندار تک یہودی اور عیسائی ہیں۔پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے۔نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے وہاں بھی ہے۔پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے۔پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں،نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔ہمت،غیرت،جوش،عزم و استقلال کے بجائے کل قوم پر (من حیث الغالب) افسردگی چھائی ہوئی ہے۔جو شخص جس حال میں ہے اس پر قانع ہے۔''[۳۵]

کئی اہل علم کا خیال ہے اور راقم الحروف کو اس سے اتفاق ہے کہ اسی سفرنامے کو ایک کامیاب سفرنامہ کہا جائے گا جس کو پڑھ کر قاری کی بصیرت میں اضافہ ہو اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوجائے کہ اے کاش! اس کی آنکھیں بھی اس ملک کی دید سے سیراب ہوں جس کا حال سفرنامے میں بیان کیا گیا ہے۔شبلی کا یہ سفرنامہ اس معیار پر پورا اترتا ہے۔حیرت ہے کہ عبدالحلیم شرر لکھنوی نے کیوں کر اس کو ایک ناکام سفرنامہ قرار دیا ہے۔[۳۶]

علامہ شبلی کے اس سفرنامے میں جو چیز بہت نمایاں نظر آتی ہے وہ بلاد اسلامیہ کے تعلیمی حالات ہیں۔مسلمانوں کے نظام تعلیم میں جدید اور قدیم کی تفریق ہی واحد خرابی نہیں ہے جیسا کہ علامہ شبلی نے سفرنامے میں جگہ جگہ لکھا ہے بلکہ سب سے بڑی خرابی جو آج بھی معمولی تغیر کے ساتھ موجود ہے،مذہبی تعلیم کا غیر قرآنی نصاب ہے۔اس میں حدیث،فقہ،علمِ کلام اور یونانی فلسفہ و منطق جیسے علوم کو قرآنِ مجید کی تعلیم پر غلبہ حاصل ہے۔ان علوم کا غیر مفید ہونا اس بات سے ظاہر ہے کہ یہ اقتضائے زمانہ کے مطابق نہیں ہیں۔مزید برآں اس طرزِ تعلیم سے مسلمانوں میں ظاہر پرستی کو فروغ حاصل ہوا ہے اور ان علوم کی تحصیل کرنے والوں کی زندگی میں تزکیۂ نفس کا جو دینی تعلیم کا مقصود ہے،ادنیٰ اثر دکھائی نہیں دیتا۔

علامہ شبلی نے اس زاویۂ نگاہ سے ترکی اور شام و مصر کے تعلیمی نظام کا جائزہ نہیں لیا ہے اور ان کی بحث ہر جگہ صرف جدید و قدیم کی تفریق تک محدود ہے۔اس کمی سے قطع نظر،شبلی کا یہ سفرنامہ اس عہد کے ترکی اور شام و مصر کے تعلیمی و تہذیبی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔کئی اہلِ علم نے اس سفرنامے کی تحسین کی ہے جن میں شیخ محمد اکرام بھی شامل ہیں۔[۳۸] اس کی مقبولیت کا ثبوت اس کی اشاعت مکرر ہے جس کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔

حوالے وحواشی

۱۔ سہ ماہی صحیفہ، لاہور (شبلی نمبر)، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۴ء، مضمون: سفرنامۂ روم و مصر و شام (شبلی)، از صاحب علی، ص:۱۶۰

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیں، حیات جاوید، الطاف حسین حالی، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص:۱۵۹

۳۔ سفرنامۂ روم و مصر و شام، ص:۹

۴۔ ایضاً، ص:۵۷ ۵۔ ایضاً، ص:۷۸

۶۔ ایضاً، ص:۷۹

۷۔ مکاتیب شبلی، مکتوب نمبر ۱۹، بنام عطیہ فیضی، ۲۶ مئی ۱۹۰۹ء، مزید دیکھیں مکتوب نمبر ۱۲۲ اور ۵۴

۸۔ سفرنامۂ روم و مصر و شام، ص:۱۱۱ ۹۔ ایضاً، ص:۱۰۶

۱۰۔ یہ پہلے گرجا تھا جسے شاہ قسطنطین نے ۳۲۵ھ میں تعمیر کرایا تھا۔محمد فاتح (سلطان ترکی) نے اس کو کسی قدر تغیر کر کے مسجد بنا لیا تھا (سفرنامۂ مذکور، ص:۱۰۳) اب ترکی حکومت نے اسے میوزیم میں تبدیل کر دیا ہے۔

۱۱۔ سفرنامۂ روم و مصر و شام، ص:۱۱۵ ۱۲۔ ایضاً، ص۱۰۵، ۱۰۶

۱۳۔ ایضاً، ص:۴۶ ۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ہفت روزہ ریاست دہلی، ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتون، جلد ۴۸، ۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء، ص: ۱۵، بحوالہ شبلی شناسی کے اوّلین نقوش، مرتبہ: ظفر احمد صدیقی، مطبوعہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۶ء، ص:۱۳۳

۱۶۔ ماہنامہ صبح اُمید، بمبئی، عید نمبر، ۱۹۵۹ء، ص:۴۴، بحوالہ شبلی شناسی کے اوّلین نقوش، ص:۱۴۱

۱۷۔ افکار سہیل، مرتبہ: شوکت سلطان و علی حماد عباسی، ص:۸۵۔۱۰۲

۱۸۔ سفرنامۂ روم و مصر و شام، ص:۱۳۴، ۱۳۵

۱۹۔ افکار سہیل، ص:۵۸۔۱۰۲

۲۰۔ یادرفتگان، ماہر القادری، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ج ۲، ص:۱۴۳

۲۱۔ افادات مہدی، ص:۳۳۴ ۲۲۔ سفرنامۂ روم و مصر و شام، ص:۱۸۰

۲۳۔ ایضاً، ص:۱۵۱ تا ۱۵۸ ۲۴۔ ایضاً ص:۱۷۱، ۱۷۲

۲۵۔ ایضاً، ص:۱۸۵ ۲۶۔ ایضاً، ص:۱۸۷

۲۷۔ ایضاً ۲۸۔ ایضاً، ص:۲۰۳، ۲۰۴

۲۹۔ ایضاً، ص:۲۲۳ ۳۰۔ ایضاً، ص:۲۲۹

۳۱۔ ایضاً، ص:۱۳ ۳۲۔ ایضاً، ص:۱۹

۳۳۔ ایضاً، ص:۲۰ ۳۴۔ ایضاً، ص:۲۵، ۲۶

۳۵۔ ایضاً، ص:۱۵۱ ۳۶۔ ایضاً، دیباچہ

۳۷۔ دیکھیں ماہنامہ 'دل گداز' مدیر، شرر لکھنوی، شمارہ دسمبر ۱۹۱۴ء

۳۸۔ یادگارِ شبلی، شیخ محمد اکرام، لاہور ۱۹۹۴ء، ص:۱۹۸

◆◆◆